صدف تبسم

امیر مینائی کی اردو نثری تصانیف

برّصغیر کی شعری اور ادبی تاریخ میں یوں تو بے شمار ہستیاں چمکتی نظر آتی ہیں لیکن ان بڑے ستاروں کے سامنے کچھ ستارے آج بھی دنیائے ادب کے اُفق پر تابندہ ہیں جن میں ایک اہم نام ''امیر مینائی'' کا ہے۔ وہ ایک با کمال شاعر، مستند زبان داں اور صاحبِ فن اُستاد تھے۔ وہ بیک وقت عالم، صوفی، فقیہ، لغت نویس، تذکرہ نویس اور انشا پرداز تھے۔ طب، فقہ، فلسفہ، منطق، قانون، موسیقی کے علاوہ ہیئت، نجوم، رمل اور جفر میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ نعتیہ شاعری میں ان کا مرتبہ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد میں محسنؔ کاکوروی جیسے نعتیہ شاعر کی موجودگی کے باوجود نعت گوئی میں آپ کا رتبہ مسلّم ہے۔ امیر کی بے شمار خوبیوں اور کمالات کو دیکھتے ہوئے ہی ماہر القادری صاحب کو یہ کہنا پڑا کہ ''ان کی ذات جامع الکمالات تھی''[1]

امیر احمد امیر مینائی ۱۶ شعبان ۱۲۴۴ھ بمطابق ۲۳ فروری ۱۸۲۹ء کو بروز دوشنبہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔[2] مینائی نسبتِ خاندانی ہے[3]، متشرع، صوفی اور عالم خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ شاعری میں مظفر علی خان اسیر کے شاگرد ہوئے، لکھنؤ اور رام پور کے دربار سے وابستہ رہے۔۔۔ آخر وقت میں حیدر آباد کا سفر کیا لیکن بیماری نے دربار سے وابستگی کی مہلت نہ دی اور وہ ۱۹/ جمادی الآخر ۱۳۱۸ھ بمطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو اکھتر برس کی عمر میں ہم سے رخصت ہو گئے۔[4]

افسوس تجھ کو رحم نہ آیا کہ اے اجل! مارا کہاں امیرِ غریب الدیار کو [5]

''محامد خاتم النبیین'' میں شامل نعت کے اس شعر میں امیر نے نہ صرف غربت میں قضا آنے کی پیشین گوئی کی ہے بلکہ ان کے سالِ رحلت کی پیشین گوئی بھی پوری ہوگئی۔

اب نہ ٹھہروں جو کرے میری خوشامد بھی وطن کہ پکارا ہے ''غریب الوطنی'' نے مجھ کو (۱۳۱۸ھ) [6]

امیر کی نثری تصانیف:

حضرتِ امیر مینائی شاعر تو تھے ہی با کمال، لیکن ان کی نثری خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، وہ نہ صرف ایک اچھے نثر نگار ہیں بلکہ ابتدائی زمانے میں تو انھیں زبانِ لکھنؤ کا بہترین وارث کہا جا سکتا ہے۔ خالد مینائی صاحب ''غیرتِ بہارستان'' میں لکھتے ہیں ''ان کی اردو نثر کا طرز ٹھیٹ اور دلنشین ہوتا ہے۔''[7]

زبان دانی ان کی میراث تھی اور علم و فضل ان کا سرمایہ، وہ اردو، فارسی، عربی، بھاشا اور سنسکرت کے عالم تھے لیکن وقت

گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی نثر سادہ اور سلیس ہوتی گئی۔ ''رمز الغیب'' اور رموزِ غیبیہ'' ان ہی کی تصانیف ہیں، ''ست سیہ بہاری'' کی شرح کے مصنف ہیں، واجد علی شاہ کی تصنیف ''نغمۂ قدسی'' پر ''شرح صوت المبارک'' کے نام سے حواشی ان ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ

''امیر مینائی کی ذات گوناگوں کمالات کی حامل تھی، وہ شاعر نہ ہوتے تو بھی بہت کچھ ہوتے۔ صرف 'شاعری' ہی ان کا سرمایہ عزّ و افتخار نہیں ہے۔''[۸]

امیر اللغات'' اور ''انتخابِ یادگار'' ان کی زبان دانی کا منہ بولتا ثبوت ہیں اس کے علاوہ ان کے مکتوبات میں ان کی نثر کے جوہر اپنی چمک آج بھی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ جس طرح شاعری میں آپ اپنا جواب نہیں رکھتے اسی طرح نثر نگاری میں بھی آپ کو یدِ طولیٰ حاصل تھا، آپ کی نثر میں فصاحت و بلاغت دونوں کا حصّہ برابر ہے، آپ کی نثری تصانیف گو قاری کو بہت زیادہ متاثر نہیں کرتیں لیکن آپ کے الفاظ کا چناؤ، اُن کی نشست و برخاست پڑھنے والے کو اپنی طرف راغب ضرور کرتی ہے۔ یہاں امیر مینائی کی نثری تصانیف کا ایک مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے:

انشائے نادری:

امیر نے شہزادے ''ندرۃ السلطنۃ عرف نادر میرزا'' کو پڑھانے کے لیے ایک کتاب بھی لکھی۔ جس کا نام ''انشائے نادری'' رکھا۔

نثر در تعریف قیصر باغ:

امیر کی اردو نثر کا سب سے پرانا نمونہ ان کی نثر در تعریف قیصر باغ ہے، جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے یہ نثر قیصر باغ (لکھنؤ) کی تعریف میں لکھی گئی ہے۔ واجد علی شاہ کی معزولی سے پہلے ۱۸۵۶ء میں امیر ان کے دربار سے منسلک ہو گئے تھے[۹]، اسی زمانے میں جانِ عالم پیا کے قیصر باغ میں میلے ہوا کرتے تھے یہ اسی زمانے کی تحریر ہے۔ اس کا ایک خوشخط نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے جو فل اسکیپ سائز کے گیارہ اوراق پر پھیلا ہوا ہے ہر صفحے پر گیارہ سطریں ہیں، جلی خط اور روشنائی سیاہ ہے۔ نقطے بالالتزام سرخ روشنائی سے لگائے گئے ہیں[۱۰] کریم الدین احمد صاحب نے اپنی کتاب ''امیر مینائی اور ان کے تلامذہ'' میں اس نثر کو شامل کیا ہے۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

سبحان اللہ! نئے رنگ کا باغ ہے کہ گل بے خار، لالہ بے داغ ہے، موجہائے بوئے گل سے مستانِ باغ کے دماغ سرشار ہیں مرغانِ خوش الحان انہی کے تیر ہوس کا شکار ہیں۔ پتوں کی سبزی پھولوں کی سُرخی سے ہوش گم ہیں بہار کی شوخی ابرِ بہار کی نیرنگی سے ہر شاخ گلِ طاؤس کی دُم ہے۔۔۔ سبزی نے فرشِ زمرّدیں نہیں بچھایا ہے طاؤسانِ جنّت کے پروں کا سایہ ہے۔۔۔''[۱۱]

گو کہ قیصر باغ کی تعریف کرتے ہوئے امیر کی نثر اہلِ لکھنؤ کی طرح قافیے کی پابند ہے اور تشبیہات و استعارات سے آمیز ہے لیکن پھر بھی ان کی نثر ایک سادگی کی طرف آمادہ ہے، کہیں تو الفاظ کا ایسا استعمال ہے کہ:

''شبنم کو اندک حرکت دیجیے کٹوروں آب کوثر پیجیے وقار آرمیدگی ہوا سے دودِ مجمر لالہ تہ نشین ہے، تمکینِ اعتدال سے آتش چراغ یاقوت نگیں ہے۔۔۔''[۱۲]

اور کہیں اتنے سادہ الفاظ استعمال کیے ہیں کہ لگتا ہی نہیں کہ یہ امیر کے لکھنوی دور کی تحریر ہے۔

''یوں تو فصلِ گل میں ہر ایک اپنے کام میں ہے مگر انصاف سے دیکھیے تو صبا بڑے اہتمام میں ہے۔ دمبدم صحرا سے چمن، چمن سے صحرا کو جاتی ہے۔۔۔''[۱۳]

صرف ابو محمد سحر اور کریم الدین صاحب نے اس ابتدائی نثر کا ذکر کیا ہے، باقی سب مصنفین (مولوی احسن اللہ ثاقب، علوی، حکمت، آہ، جلیل، آفتاب) کی تحریریں اس کے ذکر سے خالی ہیں، نبیرۂ امیر مینائی جناب اسرائیل احمد مینائی نے خیابانِ آفرینش اور محامدِ خاتم النبیین کے نئے ایڈیشن میں جو ۲۰۱۰ء میں طبع ہوا ہے ''نثر در تعریفِ قیصر باغ'' کو غیر مطبوعہ قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے جب کہ کریم الدین احمد صاحب نے یہ پوری تصنیف اپنی کتاب میں شامل کی ہے اور ان کا یہ دعویٰ ہے کہ:

''چونکہ یہ اُن کی بالکل ابتدائی زمانے کی نثر ہے اور اب تک طبع نہیں ہوئی اس لیے پوری نثر ہدیہ ناظرین ہے۔۔۔''[۱۴]

گو ہمیں ''نثر در تعریف قیصر باغ'' کا پورا متن دستیاب ہے جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

''بسم اللہ الرّحمٰنِ الرّحیم

سبحان اللہ! نئے رنگ کا باغ ہے کہ گلِ بے خار لالہ بے داغ ہے۔۔۔''[۱۵]

اور اختتام ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

''بہر حال اب داستان کو مختصر کرنا بہت ہے، ہونا وہی ہے جو کچھ مقدّر ہے۔ لازم ہے کہ زبان برنگِ سوسن کی طرح محوِ دُعا رہے۔ شام و پگاہ بعد حمد و ثنائے شاہ وجم جاہ اس شعر سے زبان آشنا رہے۔

جو عدوئے باغ ہو برباد ہو کوئی ہو گلچیں ہو یا صیّاد ہو۔''[۱۶]

شرح ارشاد السّلطان و ہدایۃ السّلطان:

یہ دونوں کتابیں واجد علی شاہ کے عربی متن ''ارشاد السّلطان'' اور ہدایۃ السّلطان'' کی شرحیں ہیں جو فارسی زبان میں لکھی گئیں ان کا سنِ تصنیف ۱۲۶۸ھ بتایا گیا ہے اور یہ تصانیف غدر سے قبل لکھ کر واجد علی شاہ بادشاہِ اودھ کے حضور میں پیش کی گئیں تھیں جن کے صلہ میں سرکارِ شاہی سے خلعت اور انعام مرحمت ہوا۔[۱۷] واجد علی شاہ کے دربار میں امیر کی حاضری کا سال ۱۲۶۸ھ ہے اور یہ اسی سال کی تحریریں ہیں۔۔ ابو محمد سحر صاحب اس بیان کی صراحت میں لکھتے ہیں ''واجد علی شاہ کے دربار میں امیر کی باریابی کا سال امیر کے تذکرہ نگاروں نے ۱۲۶۹ھ لکھا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ شرح ہدایت السّلطان کے دستیاب ہونے سے یہ معلوم ہوا کہ یہ کتاب

۱۲۶۸ھ کی تالیف ہے۔ ''رموزِ تدقیقات'' اس کا تاریخی نام ہے۔''۱۹

اس سے یہ بات تو ثابت ہوئی کہ ۱۲۶۸ھ یا اس سے پہلے امیر کی رسائی دربارِ واجد علی شاہ میں ہو چکی تھی۔ اس کتاب کے متن کے بارے میں ممتاز علی آہ لکھتے ہیں۔

> ''بادشاہ کے دو مختصر متن تھے جو کسی خاص فن میں نہ تھے اور صحت وغیرہ میں بھی پایۂ اعتبار سے گرے ہوئے تھے، حضرت نے اپنی علمی قابلیت اور زورِ طبیعت سے اُن میں معنی پہنائے اور کھینچ تان کر فنون کے قالب میں لائے۔ غلط کو صحیح بنایا اور صرف یہی نہیں بلکہ ان میں صنائع بدائع پیدا کیے ایک کا نام 'ہدایۃ السلطان' اور دوسری کتاب کا نام 'ارشاد السلطان' رکھا۔''۲۰

گو کہ اب یہ دونوں کتابیں نایاب ہیں لیکن ابو محمد سحر صاحب نے اپنے ایک مضمون میں شرح ہدایۃ السلطان (مطبوعہ) پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب کی ملکیت بتایا ہے۔۲۱ جب کہ ارشاد السلطان نایاب ہے۔

زاد الامیر:

دعاؤں کا مجموعہ ہے جو ۱۳۱۰ھ ۲۲ میں مرتب ہوا اور اسی سال شائع ہوا، امیر کی نثری تصانیف میں ادبی نوعیت کی تصانیف کم تعداد میں ہیں جب کہ زیادہ تر مذہبی ہیں جن کا واعظانہ اور ناصحانہ پہلو ہمیشہ لوگوں کے دلوں کو مسخّر کرتا رہا ہے ان کے رسالے 'زاد الامیر' اور وظیفہ جلیلیہ' ادعیہ اور وظائف کی دنیا کی چیز ہیں

> ''زاد الامیر کی تالیف اس طرح ہوئی کہ جب ۱۳۱۰ھ میں محمد عبدالرحمٰن خان مالک مطبع نظامی کان پور آئے تو انھوں نے امیر سے دُعاؤں کا ایک جامع رسالہ مرتب کرنے کی فرمائش کی، اسی دور میں جب حکیم قیام الدین امیر کے مہمان ہوئے تو انھوں نے اپنے عمِ اکرم مولوی کرامت علی جونپوری کا لکھا ہوا ایک رسالہ ادعیۂ مسنونہ امیر کو دکھایا، امیر نے اس سے دعائیں منتخب کر کے اپنی زبان میں ان کے فائدے اور ترجمے لکھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کچھ دعائیں اذکار امام نووی قول الجمیل، طبِ نبوی اور احیاء العلوم وغیرہ سے اخذ کیں، دعاؤں کے انتخاب اور ان کے فوائد اور تراجم قلم بند کرنے میں امیر نے اختصار اور آسانی کا خاص طور سے خیال رکھا تا کہ عوام الناس، عورتوں یہاں تک کہ بچوں کو بھی سمجھنے میں دشواری نہ ہو، جب یہ رسالہ پورا ہو گیا تو امیر نے اس کو سیّد محمد شاہ محدّث رام پوری کی خدمت میں پیش کیا اور ان کی ہدایت کے مطابق رسالے کی اصلاح کی کہیں کہیں غالباً اختلاف کے سبب سے ان کے ارشادات امیر نے حواشی میں درج کیے ہیں رسالے کا نام بھی شاہ صاحب نے ہی تجویز کیا تھا۔۔۔''۲۳

۷۴ صفحات کے اس رسالے میں دعاؤں کے علاوہ وعظ و نصیحت کے بیانات ہیں جن کی زبان بے حد آسان اور عام فہم ہے۔۔۔ امیر کی اوّلین نثر کے نمونے دیکھتے ہوئے ہم یہ توقع نہیں کر سکتے تھے کہ وہ اتنی سلیس اور سادہ زبان استعمال کریں گے لیکن در اصل مذہبیات ایک ایسا موضوع ہے جس کو سمجھانے کے لیے عام لوگوں کی زبان اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے سو امیر نے ایسا ہی کیا؛

''اللہ تعالیٰ نے جو اپنے بندوں کے لیے زمین کو قیام گاہ بنایا ہے تو اس سے یہ غرض نہیں کہ اس پر اونچے اونچے مکان بنائیں اور عیش وعشرت میں پڑ کر غفلت کی زندگی بسر کریں بلکہ مقصود یہ ہے کہ آرام پائیں اور نفع اُٹھائیں اور موانع عبادت و بندگی کو دفع کریں۔ اور ہر نعمت کو دیکھ کر نعمتِ اخروی کو پیشِ نظر رکھیں اور اپنے آپ کو مسافر اور دنیا کو سرائے فانی جانیں۔۔۔''[۲۴]

مؤلف نے اپنی کوشش سے تقریباً ہر موقع کے لیے دعائیں اور عمل اس رسالے میں جمع کر دیے ہیں۔ زادالامیر کا پورا نام ''زادالامیر فی دعوت البشیر النذیر'' ہے، یہ دعاؤں کا مجموعہ ہے جسے امیر نے ۱۳۱۰ھ میں مالک مطبع نظامی کان پور کی فرمائش پر مرتب کیا۔[۲۵]

نماز کے اسرار:

نماز کے ارکان سے متعلق یہ رسالہ ۱۳۱۱ھ میں طبع ہوا[۲۶]۔ نماز کے اسرار سے متعلق ایک رسالہ جس کا پہلا ایڈیشن ۱۳۱۱ھ میں مطبع، مفیدِ عام آگرہ سے طبع ہوا اس کی اشاعت کے بارے میں ابومحمد سحر صاحب صراحت کرتے ہیں:

''اس رسالے پر تاریخِ طباعت درج نہیں ہے خطوط کی مدد سے ۱۳۱۱ھ متعین کی گئی ہے۔''[۲۷]

کیوں کہ امیر نے اپنے دو رسالوں کا ذکر جون ۱۸۹۴ء میں مطابق ذی الحجہ ۱۳۱۱ھ کے اپنے دو خطوں میں کیا ہے۔ ایک خط کا اقتباس ہے:

''فقیر نے دو رسالے بامید ذریعہ نجات و باقیات الصالحات ہونے کے تالیف کیے ہیں اور چھپوائے ہیں۔''[۲۸]

ایک دوسرے خط میں زاہد سہارنپوری کو اس رسالے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں؛

''دو رسالے نو تالیف جو ذریعۂ نجات و باقیات الصالحات ہونے کی امید پر میں نے چھپوائے تھے ایک ایک نسخہ ان کا آپ کو بھی بھیجتا ہوں امید ہے کہ عنقریب ان کی رسید آئے۔''[۲۹]

ان رسالوں میں امیر کی نثر کا یک ہی انداز ہے، سادہ اور ناصحانہ اور سب سے بڑی بات یہ کہ؛ عام فہم بھی۔۔۔ ملاحظہ کیجیے:

''غور کرنا چاہیے کہ انسان اشرف المخلوقات کیوں ہے؟ اور کس صفت نے اس کو 'ولقد کرمنا بنی آدم' کا خلعت پہنایا ہے اس سے بحسبِ ظاہر زیادہ عاجز اور ناقص کوئی چیز نہیں کہ نہ اس کو گرمی سردی کی برداشت ہے نہ بھوک پیاس کا تحمل، ذرا سے درد میں تڑپ جاتا ہے، ذرا سی مصیبت کی تاب نہیں لاتا ہے اس کے علم کی طرف دیکھیے تو بالکل بے حقیقت ہے، اگر ایک رگ بھی اس کے دماغ میں بے محل ہو جائے تو صحت میں خلل ہو، دیوانوں کی طرح تنکے چننے لگے۔۔۔ اگر اس کی قوّت کا خیال کیجیے تو اس سے عاجز کوئی نہیں۔ ایک پسو ایک بھنگے تک سے جیت نہیں سکتا۔ نمرود سے طاقتور بادشاہ کو مچھر نے ہلاک کر ڈالا اور اس کے اتنے بڑے لشکر کو تباہ کر دیا۔۔''[۳۰]

غرض یہ کہ ان رسائل میں مذہبی موضوعات کو اس آسانی سے بیان کیا ہے کہ قاری قائل بھی ہو جاتا ہے اور دل چسپی بھی برقرار رکھتا ہے، نماز کے اسرار کے سرورق پر سیّد محمد شاہ محدّث بن سیّد حسن شاہ محدّث کی یہ رائے درج ہے:

''میں نے اس رسالے کو بغور دیکھا مضامین اس کے بلاشبہ صحیح اور کلام فصیح ہے مؤلف کی عذوبت لسان اور فصاحتِ بیان، جوشِ طبیعت اور خلوصِ نیّت اس سے ظاہر ہے اور اسرارِ طہارت شریعت اور انوارِ تہذیب طریقت باہر۔ اثرِ فیض صوفیائے کرام اور رقّت قلب علمائے اسلام کا نمونہ ہے، اور خوبی صلوٰۃ کا مجموعہ۔ ایسا دل چسپ رسالہ اور صلوٰۃ کا عجالہ کم نظر سے گزرا ہوگا، الٰہی ایسی نماز سب مسلمانوں کو نصیب کرے۔''۳۱

۵۲ صفحات کے اس رسالے میں امیر کی طرزِ نگارش بہت سادہ اور رواں ہے جیسا کہ عام مذہبی رسائل میں ہوتا ہے اس میں امیر نے اپنی زبان دانی کی مہارت اور فصاحت و بلاغت سے کام نہیں لیا بلکہ عام فہم زبان میں خالص دینی مسائل کو آسانی سے بیان کر دیا ہے۔ ہاں خلوصِ نیّت اور دینی علوم کے ساتھ ساتھ شریعت کے تمام پہلوؤں کو بھی سامنے رکھا گیا ہے۔

وظیفۂ جلیلیہ: (صبح وشام پڑھنے کیلیے یہ وظیفہ ۱۳۱۲ھ میں طبع ہوا۔۳۲)

وظیفۂ جلیلیہ بھی اسی طرح کا ایک رسالہ ہے اس کے ساتویں صفحے تک امیر نے دُعا کی فضیلت اور آداب بیان کیے ہیں۔ آٹھویں صفحے سے بارھویں صفحے تک صبح وشام پڑھنے کا وظیفہ درج ہے۳۳۔ ابتدا میں امیر لکھتے ہیں:

''حمد ونعت کے بعد سراپا تقصیر فقیر امیر مسلمان بھائیوں کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ یہ رسالہ مختصر احادیثِ معتبر سے انتخاب کر کے اہلِ اسلام کے نفع عام کے واسطے لکھا ہے اور ''وظیفہ جلیلیہ'' اس کا نام رکھا ہے۔ مومنین سے امید ہے کہ اس سے دین ودنیا کا نفع اٹھائیں اور اس خیر خواہ اہلِ ایمان کو دُعائے خیر سے یاد فرمائیں۔۔''۳۴

انتخاب یادگار:

انتخاب یادگار رام پور کے شعراء کا تذکرہ ہے۔ تذکروں کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ تذکرہ نگار اس دور کے مفصل تاریخی اور معاشرتی پس منظر کو مدنظر رکھتے ہوئے شاعروں کے مختصر حالاتِ زندگی اور ان کی شاعری سے انتخاب پیش کرتا ہے جس سے نہ صرف ہم چھوٹے بڑے تمام شعرا سے واقفیت حاصل کرتے ہیں بلکہ اس عہد میں پیش آنے والے بہت سے واقعات کا تاریخی ثبوت بھی پیش کرتے ہیں۔ امیر مینائی کا یہ تذکرہ بھی ان ہی خزانوں سے مالا مال ہے۔ یہ تذکرہ ''انتخاب یادگار'' ۱۲۸۹ھ میں شروع ہو کر ۱۲۹۰ھ میں مرتب ہوا اور ۱۲۹۷ھ میں تاج المطابع سے شائع ہوا۔ خود فرماتے ہیں:

اس اضافت سے یہ سارا تذکرہ ہے منتخب ورنہ کیا میری حقیقت کیا ہے میرا اعتبار
انکشافِ سال ہجری ہو اگر مدِّ نظر نام تاریخی ہے اس کا انتخاب یادگار ۳۵

۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء

آغا علی نقی تقریظ میں لکھتے ہیں:

''یہ صحیفۂ انتخاب چوتھی ذی الحجہ ۱۲۹۷ھ کو تاج المطابع میں چھپ کر مشتہر ہوا۔''۳۶

اس تذکرے کے آخر میں جلال لکھنوی صاحب کا قطعہ تاریخ طبع بھی درج ہے۔

ایک مدت سے میانِ رام پور دھوم تھی جس تذکرے کی چھپ گیا
یوں سنینِ طبع کاوش نے لکھی تحفۂ اہلِ سخن بھی چھپ گیا (۱۲۹۷ھ)

امیر نے اس تذکرے کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلے طبقے میں نواب علی محمد خان صاحب بہادر سے لے کر نواب کلب علی خاں تک تمام والیانِ ریاست رام پور کا ذکر ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ شاعر تھے یا نہیں تھے اس تذکرے میں شعراء کی کل تعداد چار سو اٹھارہ (۴۱۸) ہے جس میں والیانِ ریاست بھی شامل ہیں۔ آغا علی نقی تقریظ میں لکھتے ہیں:

''ہنگام تالیف ۱۴۰ شعراء کے نام تھے سب کے کم زیادہ کلام تھے مگر چھپنے میں تاخیر ہوئی۔ آفتاب الدولہ قلق، لالہ گوبند لال صبا، شیخ امیر اللہ تسلیم وغیرہ ملازمین (عین وقت پر) میں شامل ہوئے لہٰذا چھپنے کے وقت تک چار سو پندرہ (۴۱۵) شعرائے نازک خیال کے نام اس تذکرے میں داخل ہوئے۔'' ۳۷

ابو محمد سحر کے مطابق:

''اس تذکرے میں جن شعراء کا ذکر کیا گیا ہے ان کی صحیح تعداد چار سو اٹھارہ (۴۱۸) ہے۔ طبقہ اول کے چار شاعر والیانِ ریاست اور پانچ غیر شاعر والیانِ ریاست کا ذکر اس کے علاوہ ہے۔'' ۳۸

تذکرے کا آغاز حمدِ الٰہی سے کیا ہے اس کے بعد نبی اکرم ﷺ کی تعریف اور چاروں خلفائے راشدین کے لیے رحمت طلب کی ہے اور اس کے بعد والیٔ ریاست رام پور نواب کلب علی خان کی تعریف بیان کی ہے۔ دراصل یہ تذکرہ امیر نے نواب کلب علی خان کے حکم سے مرتب کیا تھا۔ مقدمے میں لکھتے ہیں:

''ایک دن بندگان حضور کو خیال آیا کہ ایک تذکرہ شعرائے ماضی و حال کا ایسا تیار ہو کہ اس سے خاص دارالریاستہ کے متوطن اور متوسل شاعروں کی مختصر کیفیت سخن گوئی کی حقیقت نقشِ صفحہ روزگار ہو۔ اس ضمن میں اعزاز اس ہیچمدان کا بھی منظور ہوا لہٰذا یہ ہیچمدان اس خدمت پر مامور ہوا اور محض باقتضائے عطوفتِ خسروانی آغاز سے انجام تک برابر حضور نے التفات فرمایا۔ تب یہ تذکرہ ایک سال میں تمامی پر آیا اگر ناخنِ امداد حضور گرہ کشائی نہ فرماتا ممکن نہ تھا کہ ایسا تذکرہ جامع جس میں راست راست بے کم و کاست من وعن واقعات تاریخی ہیں، ترتیب پاتا۔'' ۳۹

نواب کلب علی خان نے اس تذکرے کو مرتب کرنے کا صرف حکم صادر نہیں کیا تھا بلکہ اس کی تالیف میں در پردہ خاصا دخل تھا۔ اس بات کا اشارہ خود امیر نے اس اقتباس کے آخری حصے میں دیا ہے:

''اس بے حقیقت کی سعی مانند حرکت خامہ بدست نامہ نگار ہے۔'' ۴۰

اس بات میں تو ایک اشارہ دیا گیا ہے لیکن اس کی وضاحت امیر کے دو خطوط سے ہو جاتی ہے جو انھوں نے احسن اللہ ثاقب کے نام لکھے اور اس بات کو ان کے بیان نے ہر قسم کے شبہ سے پاک کر دیا۔ ۲۹ نومبر ۱۸۸۱ء کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''تذکرہ انتخاب یادگار حسب فرمائش سرکار مرتب ہوا اور چھپ کر سرکار میں داخل ہوا میں اپنی تالیفات کو اس قابل

نہیں جانتا کہ ہدیہء احباب کروں علی الخصوص یہ تذکرہ جس میں مجھ کو حالاتِ تاریخی اور انتخابِ اشعار میں ایسی مداخلت ہے جیسے علم کو دستِ کاتب میں ہے۔"[۴۱] (خط نمبر ۱۳۸)

یکم ربیع الاول ۱۲۹۹ھ کے خط میں تحریر کرتے ہیں:

"آپ نے لکھا ہے کہ سہارن پور پہنچ کر میں تذکرہ انتخابِ یادگار کی نسبت کچھ لکھوں گا اور اس کے مضامین سے اطلاع دوں گا لہٰذا اس کے انتظار میں اب تک جواب نہیں لکھا۔ بندہ پرور اس تذکرے میں اگر کچھ محاسن ہوں تو ان کو آپ سے ہنر بین جانیں اور جو اس میں بہ مجبوری قبائح ہیں قرار واقعی ان کو میرا دل جانتا ہے، مگر کیا کروں مامور تھا معذور تھا۔ دیباچے میں اس کا اشارہ بھی کیا ہے۔ آپ غور سے پڑھیے گا تو سمجھ جائیے گا، مولف مجبور تھا۔"[۴۲] (خط نمبر ۱۳۹)

تذکرہ جسے دو طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے طبقے میں والیانِ ریاست کا بہ ترتیب زمانہ حکومت ذکر ہے اور دوسرے طبقے میں شعراء کا تذکرہ بہ اعتبار حرفِ تہجی ہے یعنی والیان ریاست کو زمانی ترتیب سے بیان کیا ہے جس سے پورا عہد ایک تواتر کے ساتھ بیان ہو جائے گا اور تاریخی اُلٹ پھیر واقع نہ ہوں گے جب کہ شعراء کی تعداد زیادہ ہونے اور ایک نام کے کئی شاعر ہونے کی وجہ سے الف بائی ترتیب میں رکھے گئے ہیں جس سے شعرا کو ڈھونڈنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس میں عربی، فارسی، اردو اور بھاکا چاروں زبانوں کے شاعر شامل ہیں بعض شاعروں کا ایک سے زائد زبان کا کلام دیا ہے۔ چنانچہ فہرست میں انھیں ظاہر کرنے کے لیے علیحدہ علیحدہ علامتیں مقرر کی گئی ہیں۔ عربی کی علامت "ع" فارسی کی "ف" اردو کی "الف" اور بھاکا کی "ب" ہے۔ فارسی عربی کی "فع" اردو فارسی کی "فا"، فارسی اردو بھاکا کی "فبا" اور اردو بھاکا کی "با" ہے۔ بعض شاعروں کا اردو اور فارسی کا تخلص مختلف ہے۔ ان کا حروف تہجی کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ تذکرہ کیا گیا ہے۔ دیباچے میں مثال دیتے ہوئے خود لکھتے ہیں:

"جو سخنور دو زبانوں کے شاعر ہیں اور دونوں زبانوں میں تخلص ان کے مختلف ہیں تو وہ دونوں تخلص با اعتبار حروف تہجی اپنے اپنے محل پر لکھے گئے ہیں جیسے عنبر شاہ خان کو کہ فارسی میں "عنبر" اور اردو میں "آشفتہ" تخلص کرتے ہیں تو حروف الف میں آشفتہ اور حرف عین میں عنبر لکھا گیا ہے۔"[۴۳]

اس تذکرے میں تمام شاعروں کے اساتذہ کے نام، ان کی عمر اور ولدیت اور انتقال ہو جانے کی صورت میں تاریخ وفات لکھنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اسی طرح جو شعرا ریاست رام پور کے متوطن ہیں ان کی سکونت بیان نہیں کی اور جو مضافات کے رہنے والے ہیں یا ساکنِ دہلی و لکھنو وغیرہ کے ہیں اور کسی وجہ سے یہاں آ کر رہ گئے ہیں۔ مثلاً (نوکری یا وظیفہ خواری کے سبب) ان کے مقاماتِ سکونت کا نام لکھ دیا ہے۔

سب سے پہلا تذکرہ نواب محمد علی خان صاحب کا ہے جن سے ریاستِ رام پور کی بنا پڑتی ہے لکھتے ہیں:

"سردار داور خان نے ایک طفل خرد سال صاحبِ حسن و جمال ایک مکان میں دیکھا جس کی پیشانی سے آثار رشد و سعادت پیدا ہیں اور علامات اقبال و دولت ہویدا ہیں۔ اس پیکرِ سطوت و شوکت کو آغوش میں اُٹھایا اور اس نور دیدہ

اقبال چراغ خانہءشوکت و اجلال سے پوچھا کہ صاحبزادے تمھارا نام کیا ہے؟ انھوں نے محمد علی نام بتایا سردار موصوف نے اپنا فرزند ارجمند قرار دے کر علی محمد خان نام رکھا اور مربیانہ تعلیم و تربیت کرنا شروع کی۔''۴۴

یہ لکھنوی طرز کی سیدھی سادی نثر ہے۔ امیر کی ابتدائی نثر میں جو زبان و بیان کا زور تھا وہ اب کچھ سادگی کی طرف مائل ہوتا جا رہا ہے گو کہ ابھی بھی نثر کہیں کہیں مقفّیٰ ہو جاتی ہے اور لکھنویت سے باہر نہیں نکلی تاہم حالات و واقعات کو بیان کرتے ہوئے سادہ نثر ہی تحریر کی ہے۔ امیر نے بہت اختصار اور جامعیت کے ساتھ کوزے میں دریا کو سمو دیا ہے اور شعراء کے حالات لکھنے کی ممکن کوشش کی ہے اس کے برعکس والیانِ رام پور کو بیان کرتے ہوئے ان کے تاریخی پس منظر مدّنظر رکھتے ہوئے اس عہد کی پوری تصویر پیش کی ہے ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب کے بقول:

''تذکرۂ انتخاب یادگار میں نہ صرف شاعر کا حال اور کلام ملتا ہے بلکہ اس سے پہلے ان تاریخی واقعات اور روایات کی تصویر بھی سامنے آتی ہے جن پر ان کی شاعرانہ ترقی اور قدردانی کا انحصار تھا یہ تذکرے کا وہ امتیاز ہے جس میں کوئی دوسرا تذکرہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ۴۵

اس تذکرے میں مجموعی طور پر اردو، فارسی، عربی اور ہندی کلام کا ایک بہترین انتخاب جمع کیا گیا ہے۔ انتخاب میں اچھے برے ہر طرح کے شعر ملتے ہیں۔ شاید مقصد یہ تھا کہ شعراء کے رنگ کی صحیح نمائندگی ہو سکے۔ اردو کے کلام میں غزل کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن کے نمونے بھی کافی مقدار میں دیے گئے ہیں۔ اس تذکرے کی ایک خوبی اور یہ ہے کہ عربی اور ہندی کے اشعار کے انتخاب درج کرنا ہی کافی نہیں سمجھا گیا ہے بلکہ عربی اور ہندی نہ جاننے والوں کے لیے قابل فہم بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے چنانچہ عربی اشعار کا ترجمہ بھی لکھ دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر فضل حق صاحب کا کلام لکھتے ہیں:

قد حَسّنَ الحُسنُ منہا کُلّ سیئۃً   حتّی الجفآء وَسوءِ الخلق وَالشّیرِ یں

ہر آئینہ خواب کر دیا اونکی حسن نے برائیوں کو   یہاں تک کہ ظلم اور بدخلقی اور تندخوئی کو ۴۶

اور ہندی اشعار میں ہر جگہ اعراب لگا دیے ہیں جس سے ان کے صحیح پڑھنے میں مدد ملتی ہے ساتھ ہی اردو میں اُن کی تشریح بھی کر دی گئی ہے۔ مثلاً پنڈت دت رام کی کتب کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''واضح ہو کہ اس کتب میں خطاب ہے مرد کی طرف سے عورت کی طرف کہ بدگمان ہو کر آزردہ ہوگئی ہے۔ (شرح) یعنی مرد کہتا ہے عورت سے کہ تو نے جو خواب دیکھ کر جلدی سے جھجھک کر اور جھک کر پیٹھ پھیر لی ہے تو اس کا سبب کیا ہے میرے ہونٹوں پر تو کسی کا نام بھی نہیں آیا۔'' ۴۷

غرض یہ کہ تذکرہ انتخابِ یادگار نہ صرف شعراء رامپور کا ایک مستند حوالہ ہے بلکہ تاریخِ والیان رامپور کا بھی ایک اہم ماخذ ہے۔ اس تذکرے میں امیر کی نثر نگاری کے جوہر اتنے واضح نہ ہو سکے جو کہ اس کا حق تھا کیونکہ انھیں اس کام پر پوری اجارہ داری نہیں تھی بلکہ یوں کہیے کہ ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ شاید اسی لیے امیر نے صرف کچھ حالات زندگی اور انتخابِ کلام تک ہی خود کو محدود

رکھا اور شعرا پر اور ان کی شاعری پر تنقید و تبصرے سے گریز کیا۔ کچھ مشہور شعرا مثلاً غالب، اسیر، منیر اور خود مؤلف کے انتخابات میں بڑی حد تک ان کے مرتبے کا خیال رکھا گیا ہے۔ اسیرؔ کے لیے ۱۱ صفحات، غالب کے لیے ۳۲ صفحات، منیر کے ۱۲ صفحات پر مشتمل انتخاب تذکرے میں موجود ہیں جب کہ داغ کے لیے صرف ۴ صفحات کا انتخاب کیا گیا۔ اس کے برخلاف گوال رائے (۱۲ صفحات)، بلا یو (۸ صفحات)، نثار آغا (۷ صفحات) کے ساتھ شامل کیے گئے ہیں لیکن داغ اور امیر اللہ تسلیم جیسے بڑے شاعروں کے ساتھ انصاف نہ کر سکے۔ اس ضمن میں بھی ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ انتخابِ کلام کی ذمہ داری اس تذکرے میں تنہا امیر کی نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس تذکرے میں امیر بحیثیت ناقد ہمیں کہیں نظر نہیں آئے اور نہ صرف تنقیدی بلکہ توصیفی فقروں کی بھی کمی محسوس ہوئی۔ مثاص کے طور پر غالب کے مختصر حالات سے واقفیت کے بعد ان کی تصانیف کے نام اور کیفیت بیان کی ہے اور وفات تک پہنچ گئے ہیں۔ چند تعریفی جملے جو ان سے سرزد ہوئے وہ ملاحظہ ہوں:

''o- نثر و نظم اردو کی چار دانگ ہندوستان میں پکار ہے۔

o- مرزا صاحب کی طباعی اور ذکاوت ان کے نتائجِ افکار سے پیدا ہے۔ بات سے بات پیدا کرنا تمام کلام سے ہویدا ہے۔

o- یہ اُن کے کلام کا انتخاب ہے، جس کا ہر حرف لاجواب ہے۔''[۴۸]

اسی طرح کے چند تعریفی جملوں کی سند بخشی گئی ہے۔ چند معروف شعراء کو اور باقی صاحبان کے صرف حالات و انتخاب پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ایک بات تو یہ کہ شعرا کے کلام پر رائے دینے کے لیے بہت سا وقت اور محنت کی ضرورت تھی اور دوسری بات یہ کہ صرف شعرا کے شمار نے ہی تذکرے کو اتنا ضخیم کر دیا ہے اگر ان کے کلام پر اظہار خیال کیا جاتا تو اس کا حجم اور بڑھ جاتا اور یہاں بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ ہے کہ امیر کے تذکرے کے رنگوں پر نظر ڈالنے کے لیے ابھی مزید دقیق نگاہ کی ضرورت ہے جسے اس چھوٹے سے قرطاس پر بیان کرنا ممکن نہیں لیکن صرف اتنا ضرور کہوں گی کہ ''انتخابِ یادگار'' امیر کی نثر کا ایک جوہر تو ہے ہی بلکہ اپنی تاریخی حیثیت کے لحاظ سے ایک مسلّم حقیقت رکھتا ہے۔ تذکرے کی زبان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ درجہ بدرجہ منازل طے کر کے ارضی روایتوں سے جُڑی ہوئی نثر کی طرف آ رہے ہیں۔

خیابانِ آفرینش: (میلاد شریف۔ مصنفہ ۱۳۰۵ھ، مطبوعہ ۱۳۰۶ھ[۴۹])

خیابان آفرینش جناب رسالت مآب ﷺ کی ولادت باسعادت کا ذکر ہے جس کا نام تاریخی ہے۔ اس میں حمد، مناجات کے بعد سببِ تالیف اور میلاد شریف کے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد جیسا کہ میلاد شریف کے عام موضوعات ہیں یعنی پیغمبر اسلام ﷺ کی ولادت، رضاعت، نبوت، معراج، ہجرت، حلیہ اور خصائل کا بیان دیا گیا ہے۔ بالعموم روایتوں کی شکل میں دیے گئے یہ بیانات حضور ﷺ کی زندگی اور فضائل پر مبنی ہیں۔ جگہ جگہ حدیثوں کو بھی بیان کیا ہے اور روایات اور احادیث کے درمیان کہیں کہیں

فائدہ یا نکتہ کے عنوان سے ان کی مزید توضیح کی ہے اور نتائج بھی نکالے ہیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی حیاتِ اقدس اور فضائل و محامد کے متعلق دنیائے اسلام میں بعض روایتیں مشہور و مقبول چلی آتی ہیں جن کی صحت و نقاہت میں علمائے دین کو بھی کلام رہا ہے۔ بعض دوسری روایتیں متنازع فیہ ہیں اس کے علاوہ اکثر روایتوں میں لکھنے والوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر نئے اجزا داخل کیے ہیں۔ امیر کو روایت نگاری میں پیش آنے والی مشکلات کا پوری طرح احساس تھا۔ ان سے بچنے کے لیے انھوں نے خیابان آفرینش لکھتے وقت بہت محتاط ہو کر کام کیا اور جو طریقہ اختیار کرنا چاہا، اس کے بارے میں خود لکھتے ہیں:

> ''مؤلف حقیر و فقیر عرض کرتا ہے کہ جب نعتیہ مسدس ذکر شاہ انبیاء، صبح ازل، لیلۃ القدر۔۔۔ چھپے اور شیوع پا چکے تو مقصد ہوا کہ ایک میلادِ شریف نثر میں لکھا جائے اور اس میں تصحیح روایات کا بہت اہتمام کیا جائے مگر دنیا کے مکروہات سے یہ ارادہ پورا نہ ہوتا تھا۔ اب اس کا وقت آ گیا ہے کہ یہ میلاد شریف جس میں تکلفاتِ شاعرانہ و منشیانہ کو اس ڈر سے کہ مبادا کہیں حد سے تجاوز ہو جائے دخل نہیں دیا گیا۔ صاف صاف عبارات میں مستند اور معتبر۔۔۔ سے منتخب کر کے لکھا اور تاریخی نام ''خیابان آفرینش'' رکھا۔ ۵۰

امیر نے اس کی ابتدا ہی حمدیہ نثر سے کی ہے اور یہ حمد و مناجات لکھنے کے بعد اس مولود شریف کی تالیف کا سبب بیان کیا ہے کہ روایات کی تصحیح کو جانچنے کے لیے صرف کسی معتبر مصنف کا نام کافی نہیں، بلکہ اس کی تالیف کے لیے مختلف اوقات میں مختلف حالتوں پر غور کیا جانا چاہیے۔ امیر کے نزدیک اگر باریک بینی سے دیکھا جائے تو اس قسم کی تصانیف کی تین اقسام ہیں جو مختلف حالتِ تالیفات کو بیان کرتی ہیں:

۱۔ فضلا نے اپنے زمانہ طالب علمی میں استاد کو دکھانے کے یا مشق بہم پہنچانے کی نظر سے کسی کتاب کی شرح یا اس پر حاشیہ لکھا اور استاد نے بھی یہ سوچا کہ ابھی نومشق ہیں، دل بڑھانے کو پسند کیا کہ استعداد بڑھتے بڑھتے خود ہی کھرے کھوٹے اور کانٹ چھانٹ پر قادر ہو جائیں گے۔

۲۔ دوسرے کسی نے کوئی ذخیرہ جمع کرنا شروع کیا اور پہلے سب رطب و یابس، ضعیف و قوی مضامین کو اس غرض سے جمع کر لیا کہ ذخیرے پر نظر کر کے صحیح کو سقیم سے، قوی کو ضعیف سے جدا کر لیں گے اور پھر کم فرصتی یا موت نے مہلت نہ دی اور وہ ذخیرہ بغیر نظر ثانی کے رہ گیا۔

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ مصنف نے کتاب لکھی اس کے شاگردوں نے مضامین سے بحث کی، مناظرے ہوئے جہاں جہاں درستی کے قابل تھی وہاں درستگی کی گئی اس پر شرحیں اور حواشی لکھے گئے۔ فضلائے عصر میں متداول ہوئی تو یہ تصنیف محلِ نظر و جائے کلام نہ رہی۔ ۵۱

یہی حال روایاتِ مولد شریف کا ہے اس کی روایتوں میں جا بجا تنقیح و تصحیح کی بہت حاجت پڑتی ہے اور یہ بھی ہے کہ آپؐ کے ایام طفولیت کا حال صحاح میں بہت کم پایا جاتا ہے۔ اس کے لیے جب علما و فضلاء کی تحریریں شک کی روشنی میں پرکھی جا رہی ہیں تو

شاعروں اور انشا پردازوں کے لکھنے کا تو کیا اعتبار رہا؟ اس کا ذکر امیر نے اپنی تحریر میں اس طرح کیا ہے:

''ان وجوہ سے اس ہیچمداں کو یہ خیال ہوا کہ ایک رسالہ ایسا لکھا جائے جس کے پڑھنے سننے میں اہلِ علم وفضل کو مطلق تامل نہ ہو اور تکلفاتِ شاعرانہ اور تصنیفاتِ منشیانہ سے بالکل پاک ہو اس لیے شاعری اور انشا پردازی میں کسی قدر حد سے تجاوز ہو ہی جاتا ہے اور نقلِ روایت میں حد سے تجاوز کرنا سخت مواخذہ سے ڈراتا ہے۔'' ۵۲

اور اس کام کے لیے انھوں نے سید محمد شاہ محدث رامپوری سے رجوع کیا جنھوں نے مولد امام بزنجی کا ترجمہ کیا کیوں کہ اس کے ترجمے میں قافیوں کی پابندی کے باعث تحریر گنجلک ہے اور بہت سے قصوں کی طرف صرف اشارے کیے گئے ہیں جن سے بات کی صحیح وضاحت نہیں ہوتی اس لیے امیر نے اس ترجمے کو متن قرار دے کر جہاں جہاں ضرورت پڑی ''مدارج نبوۃ اور بذلِ القوۃ فی سنی النبوۃ'' جیسی معتبر کتابوں سے اس کی شرح اور توضیح کی اور اپنے نزدیک روایات معتبرہ جو صحاح اور سِیَر معتبرہ ومشہورہ کے موافق ہیں، درج کیے اور اس بات پر بھی زور دیا کہ یہ کتاب سِیَر وتاریخ کی ہے، حدیث کی نہیں ہے اور اسے اُسی نظر سے دیکھا جائے۔ خود لکھتے ہیں:

''مولود ایک کتاب سِیَر وتاریخ کی ہوتی ہے حدیث کی کتاب نہیں ہے کہ باب تصحیح میں حدیث کے قواعد اس پر جاری کیے جائیں اور اُس نظر سے دیکھا جائے، اس میں تو اسی قدر کافی ہے کہ کچھ روایات صحاح سے لے کر سِیَر مشہورہ سے لے لی جائیں۔'' ۵۳

غرض یہ کہ امیر کے لکھے گئے اس میلاد شریف میں حضور اکرم ﷺ کی زندگی اور سیرت کے وہی رنگ دکھائی دیتے ہیں جو ان سے پہلے روایتوں کا حصہ رہے ہیں لیکن اس میں امیر کی ارادت مندی، مذہبی اور علمی خلوص، جوشِ عقیدت صاف نظر آتا ہے۔

خیابانِ آفرینش کا اسلوب کافی حد تک صاف ستھرا اور شستہ ہے اور انھوں نے بالکل سیدھی سادی زبان میں تمام روایتوں کو بیان کیا ہے ہاں البتہ جا بجا عربی کے الفاظ، فقرے، اشعار اور قرآن کی آیتیں کثرت سے استعمال کی ہیں جب ہم امیر کی شاعری اور ابتدائی دور کی لکھنوی نثر کو دیکھتے ہیں اور اس کے بعد خیابانِ آفرینش کی تحریر پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ امیر کی نثر ہے۔ تبلیغ اسلام کا ایک واقعہ درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''روایت ہے کہ جب آیت ''وَاَنذِرْ عَشِیرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ'' نازل ہوئی یعنی ڈرا اپنے کنبے والے عزیزوں کو تو آپ ﷺ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر ایک ایک قبیلہء قریش کو پکارا اور جب سب جمع ہو گئے تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر میں تم کو خبر دوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک لشکر تم کو قتل کرنے آ رہا ہے تو تم یقین کرو گے یا نہیں؟ انھوں نے کہا بے شک یقین کریں گے اس لیے کہ ہم نے تم سے ہمیشہ سچی بات ہی سنی ہے۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تم کو آخرت کے سخت عذاب سے ڈراتا ہوں۔ یہ سن کر ابولہب نے کہا ''تَبًّا لَّکَ سَائِرَ الْیَومِ اَلِھٰذَا جَمَعْتَنَا'' خرابی ہو تجھ کو مدۃ العمر کیا اسی کام کے لیے ہم کو اکٹھا کیا تھا۔ پھر جب سب متفرق ہو گئے تب سورۂ تَبَّتْ یَدَا اَبِیْ لَھَبٍ نازل ہوئی۔'' ۵۴

تحریر میں سادگی کی وجہ یہ بھی لکھی گئی تھی کہ یہ میلاد شریف ہے اور روایتوں کے بیان میں انشاء پردازی کی گنجائش نہیں

ہوتی۔ظاہر ہے کہ مذہبی رسالوں میں سادہ طرزِ بیان ہی اختیار کیا جاتا ہے اور امیر نے بھی ایسا ہی کیا۔اصل میلاد کے برعکس امیر نے آخر میں جو مناجات شامل کی ہیں اس کی عبارت قدرے مقفّٰی طرز میں ہے۔

> ''خداوندکریم جب تیری تیغ عدالت پرنگاہ جاتی ہے تو میری عاجزی سپر بن کر سامنے آتی ہے۔خداوندا،اعمالِ بد پر سزاعینِ انصاف ہے مگر اُمیدوارانِ رحمت پرقہرِ عدالت اُن کی امید کے خلاف ہے۔خداوندا جو تیری رحمت کی آس لگائے ہے۔اُس کا آسرا نہ توڑ۔خداوندا،کنجشکِ ضعیف کو شہبازِ عدالت کے منہ پر نہ چھوڑ۔اے دادرس خطراتِ نفسانی کے ہاتھ دادخواہ ہوں میری داد کو پہنچ۔اے فریادرس وساوسِ شیطانی کے مظالم کا فریادی ہوں میری فریاد کو پہنچ۔''۵۵

لٰہذا پوری تصنیف میں سے صرف مناجات میں انشاء پردازی کی کچھ جھلک دکھائی دی ہے جس کا اقتباس اُوپر درج کیا ہے او ر باقی ساری تحریر سادہ پیرایۂ اظہار میں ہے جیسا کہ خود امیر نے کوشش کی تھی کہ ''تکلفاتِ شاعرانہ اور تصنیفاتِ منشیانہ سے پاک ہے۔''

امیر اللغات:

امیر کی تصانیف میں امیر اللغات ایک عدیم المثال لغت ہے۔امیر کو شروع سے ہی قواعد سے دل چسپی رہی۔الفاظ کی تلاش اور چھان بین کا انھیں بے حد شوق تھا۔صحت تلفظ اور محاوروں کے صحیح استعمال کی انھیں ایسی تلاش رہتی تھی جیسے عوارض کو موتی کی۔اس کی ایک مثال تو اُن کی کتاب ''انشائے نادری'' ہے جو انھوں نے واجد علی شاہ کے صاحبزادے کو پڑھانے کے لیے لکھی اس کے علاوہ بھی نظم ونثر میں مختلف اصناف کی کم وبیش پچاس (۵۰) کتابیں امیر کے قلم سے نکلیں لیکن لغات کی ذیل میں ان کی جو خدمات سامنے آئیں اس میں ''امیر اللغات'' ایک ایسا نمونہ ہے کہ اگر ان کا یہ منصوبہ پورا ہو جاتا تو اردو ادب کی ایک ضخیم لغت تیار ہو جاتی،جس میں الفاظ کا بیش بہا خزانہ موجود ہوتا۔''امیر اللغات'' کے آغاز وارتقاء میں امیؔر کا جو اہتمام ہمیں نظر آتا ہے اگر وہ اس تندہی سے اس کی جلدیں مکمل کر پاتے تو مستند الفاظ ومعنی کا ایک ذخیرہ اکٹھا ہو جاتا۔''امیر اللغات'' کی صرف تین جلدیں امیؔر پوری کر سکے،بقیہ کے بارے میں بہت سے بیانات موجود ہیں۔اسرائیل احمد مینائی صاحب نے ایک جگہ ان کی تعداد اکیس (۲۱) بتائی ہے۔ ۵۶ ڈاکٹر شعائر اللہ خان وجیہی نے اٹھائیس (۲۸) جلدوں کا ذکر کیا ہے ۵۷ اور ڈاکٹر کریم الدین احمد کے مطابق وہ لغت مکمل کر چکے تھے لیکن بہت سی جلدیں موسیٰ ندی کے سیلاب میں بہہ گئیں،اب صرف ۳ جلدیں باقی رہ گئی ہیں ۔۲ مطبوعہ اور ایک غیر مطبوعہ۔۵۸ میکش صاحب کے بقول اس لغت کی چھ جلدیں اور موجود ہیں جو طبع نہیں ہوئیں۔۵۹ لیکن ان تمام تصریحات وبیانات کا جواب ڈاکٹر رؤف پاریکھ صاحب نے دیا ہے اور دلائل سے یہ بات ثابت کی ہے کہ امیر کا کُل سرمایہ لغت صرف یہی تین جلدیں تھیں جن میں سے دو ان کی حیات میں شائع ہو گئیں۔'ب' سے شروع ہونے والے الفاظ پر مشتمل تیسری جلد کو ڈاکٹر رؤف پاریکھ صاحب نے تدوین کے بعد ۲۰۱۰ء میں شائع کیا ہے قیاس یہ ہے کہ چوتھی جلد پر [جو'پ' کے الفاظ پر مشتمل تھی] پر کام جاری تھا لیکن اب اس کے آثار بھی سرِ دست دستیاب نہیں ہیں۔۔پارکھ صاحب لکھتے ہیں:

''امیر نے تین جلدیں مکمل کر لی تھیں لیکن طباعت کے لیے سرمایہ نہیں تھا۔ تیسری جلد حرف ''ب'' سے شروع ہونے والے الفاظ پر مشتمل تھی۔ ''پ'' اور ''ت'' کے الفاظ چوتھی اور پانچویں جلد میں تھے اور ان پر کام ۱۸۹۸ء تک جاری رہا۔ امیر ۱۹۰۰ء میں حیدرآباد دکن چلے گئے اور وہیں اُسی سال اِن کا انتقال ہوگیا۔ لہٰذا یہ قرینِ قیاس نہیں کہ اس پریشان حالی کے زمانے میں امیر نے لغت مکمل کر لی ہو۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ امیر نے الفاظ کی فہرستیں تیار کر لی ہوں اور ان کے معنی اور اسناد لکھے جانے ہوں جو نہ لکھے جا سکے۔ سرِ دست صرف تیسری جلد دستیاب ہے۔''۶۰

اس لغت کا آغاز سر الفریڈ لائل (لیفٹننٹ گورنر شمال مغربی صوبہ و چیف کمشنر اودھ) کی فرمائش پر ہوا۔۶۱ جب انھوں نے نواب کلب علی خان سے اس کی فرمائش کی۔ نواب صاحب کی نظر نے امیر کا انتخاب کیا اور امیر نے ایک لفظ ''آنکھ'' کا نمونہ تیار کر کے بھجوا دیا جسے منظوری کے بعد ۱۸۸۶ء میں چھاپا گیا۔ ۶۲

امیر اللغات کی تیاری کے لیے امیر نے باقاعدہ طور پر ایک دفتر قائم کیا اور جدید خطوط کی پیروی کرتے ہوئے ایک بہترین لغت کی بنیاد ڈالی جس کے لیے انھوں نے نمونے کے لغات کو مشتہر کیا اور اہلِ نظر سے آرا طلب کیں۔ نہ صرف یہ کہ شعری مثالیں پیش کیں بلکہ نثری اسناد و نظائر بھی درج کیے۔ یہ سب باتیں امیر کی لغت نویسی سے دل چسپی کا مظہر ہیں۔ امیر اللغات کی سب سے نمایاں خصوصیت سائنٹیفک طریقہ تالیف، جدید رنگِ ترتیب، وسعت و جامعیت، محققانہ دقتِ نظر اور نئی زبان کا استعمال ہیں۔ امیر استاد اور ماہر زبان تھے۔ ان کا بڑے سے بڑا حریف بھی اتنا ضرور تسلیم کرے گا کہ کم از کم لکھنؤ کی زبان کے متعلق وہ اور ان کا کلام سند کا درجہ رکھتے ہیں لیکن امیر اللغات میں امیر نے اپنی ذات کو معیار بنانے کی کہیں کوشش نہیں کی۔ انھوں نے کسی لفظ یا محاورے کی سند یا مثال دیتے ہوئے اپنا ایک شعر بھی لغت میں درج نہیں کیا۔

امیر اللغات کے پہلے دو حصے "۹`۱/۲" x ۱۳ کی تقطیع پر لیتھو میں عمدہ لکھائی، چھپائی اور کاغذ کے ساتھ شائع ہوئے۔ اکبرالہ آبادی پہلے حصّے کی ظاہری زیب و زینت سے بہت متاثر ہوئے تھے، لکھتے ہیں:

''موزوں تقطیع، شفاف کاغذ، نہایت پاکیزہ، صاف چھاپا، خوشنما حروف نے دامنِ نظر کو ایسا اُلجھایا کہ بمشکل صورت سے معنی کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔''۶۳

اس کے علاوہ کئی اور اعتبار سے بالکل نئے طریقے اپنائے گئے لغت کا ہر صفحہ دو کالموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ لغات جلی قلم اور معنی معمولی قلم سے لکھے گئے ہیں۔ جن شعراء کے اشعار سند میں دیے گئے ہیں ان کا تخلص لغات سے کم اور معنی سے زیادہ جلی قلم سے لکھا گیا ہے۔ لغات میں اعراب لگائے گئے ہیں اور معانی میں حسبِ موقع اوقاف خصوصاً واوین، قوسین اور سوالیہ نشان کا استعمال کیا گیا ہے۔ نوٹ باریک قلم سے ہی متن کے نیچے خط کھینچ کر کالموں کے اندر درج کیے گئے ہیں۔ امیر اللغات کے دو حصے الف ''ممدودہ'' اور ''الف مقصورہ'' دونوں حصے نہ صرف جامع اور مبسوط لغت بلکہ اردو زبان کے اچھے قاموس ہیں۔ امیر اللغات کی تیسری جلد جو بائے

موجدہ پر مشتمل ہے۔امیر کے انتقال کے ۱۱۰ سال بعد اورینٹل کالج لاہور نے چھاپی جس کی ترتیب وتدوین ڈاکٹر رؤف پاریکھ صاحب نے کی ہے۔خوبصورت جلد کے ساتھ امیر اللغات کی تیسری جلد جس میں ''ب'' سے شروع ہونے والے الفاظ لکھے گئے ہیں۔ رؤف پاریکھ صاحب نے اسے جدید املا میں تحریر کیا ہے اور امیر مینائی صاحب کی دلی خواہش پوری کردی ہے۔

پہلے حصے کی کاپیوں کی تصحیح کے دوران میں ممتاز علی آہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''۳ جزو ۴ ورق کاپیوں کے آئے اور مقابلہ ہوکر آئے ہیں ان پر بے مبالغہ کئی سو غلطیاں ہیں اور یہ نقصانِ املا کہ آنکھ کو آنکہ اور ساتھ کو ساتہ اور کچھ کو کچہہ وغیرہ وغیرہ ہزاروں جگہ لکھا ہے۔اس کا تدارک تو نہیں ہوسکتا۔ہائے مخلوط کا دوچشمی لکھنا کیسا یائے مجہول ومعروف کے لکھنے میں بھی کہیں کہیں نقصان ہے''ہے'' کو کہیں''ے'' سے لکھا ہے، کہیں معکوس ہے۔الغرض املا کے اعتبار سے امیر اللغات مطلق قابلِ التفات نہیں ہے۔'' ۶۴

امیر نے جو غلطیاں پہلی اور دوسری جلد میں کیں تیسری جلد میں بھی اس کا اہتمام رہا۔مثلاً اندراجات کی ترتیب میں ترجیحاتی مسائل اور تلفظ یا اعراب دمعنی کے کچھ مسائل، املا کے بنیادی مسائل وہ سب ہی تیسری جلد کا بھی حصہ رہے۔ڈاکٹر رؤف پاریکھ صاحب نے املا کو تو جدید کردیا لیکن امیر کی ترتیب کو نہیں چھیڑا، اُسے برقرار رکھتے ہوئے حواشی میں اس کی وضاحت کرتے چلے گئے ہیں۔

غرض یہ کہ امیر اللغات امیر مینائی کی تحقیقی کاوشوں کا ادھورا ثمر ہے، ممکن ہے یہ پورا ہوجاتا تو قاموسِ ادب میں ایک نیا باب رقم ہوتا۔امیر اللغات کے علاوہ بھی امیر نے لغت پر کافی کام کیا، لفظیات، لغات اور فرہنگ نویسی کے میدان میں میں انھوں نے اردو اور فارسی کی کئی قابلِ قدر تصانیف چھوڑی ہیں۔جس میں ''سرمۂ بصیرت''، ''بہارِ ہند''، اور ''محاورات ومصادر اردو'' قابلِ ذکر ہیں، جو ابھی تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوسکے۔ان کے علاوہ متفرق تصنیفات میں ''فرہنگِ محاوراتِ اردو''، ''معیار الاغلاط''، ''اسناد کے اشعار''، ''نمونۂ لغت اردو'' اور ''فرہنگِ محاوراتِ اردو'' قابلِ ذکر ہیں۔جن کے بارے میں تفصیل ڈاکٹر رؤف پاریکھ صاحب نے اپنے مضمون ''امیر مینائی کی لغت نویسی اور اصولِ لغت نویسی'' مشمولہ ''تحقیق'' میں بیان کی ہے۔۶۵

مکاتیبِ امیر:

مکاتیب دراصل کسی ادیب کی زندگی کا وہ پیرایہ ہوتے ہیں جو اس کی زندگی کے بہت سے ایسے گوشوں کو نمایاں کرتے ہیں جن سے ادیب اور اس دور کے لوگ آشنا نہیں ہوتے۔۔۔زندگی کے حقائق سے پردہ اُٹھتا ہے تو کہیں تاریخ مرتّب کرنے میں دلائل ہاتھ آتے ہیں، مختلف واقعات کی نشاندہی کی جاتی ہے اور محقّق کو صحیح اور غلط کا فیصلہ کرنے میں آسانی ہوجاتی ہے۔یہ وہ سب چیزیں ہیں جن کا خیال مکتوب نگار خط لکھتے ہوئے نہیں رکھتا بلکہ یہ اس کی اضافی افادیت ہے۔امیر مینائی کے خطوط بھی ان تمام خوبیوں کے حامل ہیں، نہ صرف یہ بلکہ ان کے خطوط سے ہمیں اس دور میں مستعمل زبان کا بھی ٹھیک اندازہ ہوجاتا ہے۔

''مکتوبات میں ان کے قلمی نگارشات کے محرّکات یان کی تصانیف کے پس پردہ عوامل کا اندازہ لگانا ممکن اور ان کی تصانیف

کے منصۂ شہود پر آنے کی وجوہات اساسی، ضمنی اور ذیلی مصادر کو بھی دیکھا جا سکتا ہے یا ان کی طرف ذہن منتقل ہو سکتا ہے، اس مطالعے سے تصانیف وتخلیقات کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔''[۶۶]

امیر مینائی کے زیادہ تر خطوط ان کے شاگردوں کے نام ہیں اور ان کے مکاتیب کا ایک مجموعہ ''مکاتیبِ امیر مینائی'' کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔ امیر کی زندگی میں تو ان مکاتیب کو جمع کرنے کی کوئی صورت نہ نکل سکی لیکن ان کی وفات کے بعد ان کے شاگرد ''احسن اللہ ثاقب'' نے اس کام کو انجام دینے کا بیڑہ اُٹھایا۔ شروع میں ان کا ارادہ تھا کے صرف وہ مکاتیب شامل کیے جائیں جن میں کہ ادب کی رنگینی ہو یا فنِ شعر کے متعلق کوئی نکتہ، بحث یا کوئی بات ہو۔ لیکن انھیں شبلی جیسے نابغۂ روزگار کا مشورہ ملا جس میں تمام مکاتیب کو بلا کم وکاست شائع کرنے کا خیال تھا۔

> ''میرا قصد تھا کہ صرف وہ خطوط کتابی حیثیت میں شائع کیے جائیں کہ جن میں کہ ادب کی رنگینی ہو یا فنِ شعر کے متعلق کوئی نکتہ، بحث یا کوئی بات ہو مگر شمس العلماء مخدوم حضرت مولانا شبلی نعمانی دامت اضافتہم نے فرمایا کہ نہیں تمام تحریریں جو مل سکیں بلا ترک وحذف درج کی جائیں کیوں کہ مصنف کے فقرے فقرے اور لفظ لفظ سے اس کے حالات، خیالات، ذکاوت اور طبیعت کا پتہ لگتا ہے۔[۶۷]

اور اس طرح امیر کے مکاتیب کا ایک قابل قدر مجموعہ شائع ہو گیا۔ ''مکاتیبِ امیر مینائی'' امیر کے مکاتیب کا دوسرا اور آخری ایڈیشن ہے جو ۱۹۲۴ء میں لاٹوش روڈ لکھنؤ سے شائع ہوا۔ جس میں چھوٹے بڑے ۲۳۳ مکاتیب ہیں۔ انکے تقریباً چالیس مکاتیب اس وقت تک دوسرے کتب ورسائل میں شائع ہو چکے ہیں اس طرح ان کے مطبوعہ مکاتیب کی مجموعی تعداد پونے تین سو تک پہنچتی ہے۔[۶۸]

مکاتیبِ امیر کا پہلا ایڈیشن جو ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ کے دیباچے میں احسن اللہ ثاقب کا بیان ہے:

> ''اس مجموعے کی ترکیب اگست ۱۹۰۷ء میں کی گئی تھی، مگر خطوط اور سوانح اسناد کے انتظار میں اب نومبر ۱۹۱۰ء میں بہت کچھ ترمیم اور اضافے کے بعد شائع ہوتا ہے۔ اس کتاب کا تاریخی نام ''خطوطِ منشی امیر احمد'' (۱۳۲۸ھ) ہے۔[۶۹]

امیر کے خطوط کے بارے میں ثاقب کا یہ بیان ہے کہ امیر کے خلفِ اکبر محمد احمد صاحب اور مرحوم کے تلامذہ حضرتِ جلیل نے خطوط کی فراہمی میں بالکل معاونت نہیں کی۔[۶۸] جس کے باعث ان کے بہت سے مکاتیب آج بھی قارئین کے منتظر ہیں۔ امیر کے مکاتیب پر سندھ یونیورسٹی جامشورو سے ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی لیکن وہ مقالہ بھی ابھی تک طباعت سے محروم ہے۔ مکاتیب امیر میں جن شخصیات کو لکھے گئے خط شامل کیے گئے ہیں ان میں جناب زاہد سہارنپوری، حکیم برہم، کوثر خیر آبادی، احسن اللہ ثاقب، مرزا داغ دہلوی، مولوی نور الحسن خلف حضرت محسن کاکوروی، مولوی حبیب الرحمن شیروانی اور حضرت صفیر بلگرامی، حضرت جلیل لکھنوی کے علاوہ دیگر تلامذہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں مکتوباتِ امیر پر تبصرے بھی شامل کیے گئے جن میں الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، سید علی محمد صاحب شاد، نظم طباطبائی، محسن کاکوروی، امیر احمد علوی اور حسرت موہانی شامل ہیں۔ خط میں اسلوب کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔۔ ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر رقم طراز ہیں کہ:

خط میں اسلوب کی بڑی اہمیت ہوتی ہے کیوں کہ سلجھی ہوئی نثر خطوط کی فضا کو تکلفات سے پاک کر دیتی ہے۔ اسلوب کے علاوہ املا، انشا، تاریخ، سنہ، مقامِ تحریر، خط نگار کے نام لکھنے کا ڈھنگ، یعنی اپنے نام سے قبل کا لفظ جو ہر شخص کے ذہن کا اعلامیہ ہوتا ہے۔ مثلاً خاک سار، حقیر، مخلص، خیر خواہ، دُعا گو وغیرہ۔ ان تمام باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ خط نگار کو قواعد و بلاغت کے اصولوں سے کس حد تک واقفیت اور زبان پر کتنی قدرت حاصل ہے اور وہ ان چیزوں کا کتنا احترام کرتا ہے۔۔۔ مگر یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر وجود میں آنا چاہیے، کیوں کہ خط کا حسن بے ساختگی میں مضمر ہے۔'' ۵ے[تحقیق''، شمارہ ۲۰، جنوری تا جون ۲۰۱۲ء، ص۔۱۰]

اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ امیر کی مکتوباتی نثر میں اسلوب کی تمام وہ خوبیاں موجود تھیں جو کسی مکتوب کا حسن ہیں۔ وہی بے تکلف فضا، وہی سلاست و روانی۔ امیر کے مکاتیب پر ان کی شخصیت کا گہرا اثر تھا۔ خلوص و نیک نیتی، عجز و انکسار، خود داری و وضعداری، صلح جوئی و رواداری، تسلیم و رضا، حق شناسی و خدا پرستی غرض یہ کہ ان کی شخصیت کے تمام پہلو ان کے مکاتیب کے آئینے میں واضح نظر آتے ہیں۔

گنجینۂ قوافی:

بقول ممتاز علی آہ اس میں ''الف سے یا تک قوافی جمع کیے گئے ہیں'' ا ے اور اسرائیل احمد مینائی صاحب کے بیان کے مطابق یہ غیر مطبوعہ ہے اور الف سے ی تک قافیوں پر مبنی ہے۔ ۲ ے اس کا نسخہ اب دستیاب نہیں ہے۔

جانِ تاریخ:

بقول ممتاز علی آہ یہ غیر مطبوعہ ہے اور ''اس میں عربی اور فارسی کے ہم عدد الفاظ مجتمع کیے گئے ہیں'' ۳ ے لیکن اب یہ رسالہ بھی نایاب ہے۔

دوسری متفرق نثر میں مولوی طالب حسن کی کتاب '' آئینۂ ایمان کا دیباچہ'' دیباچۂ امیر اللغات (حصّہ اوّل)''، '' دیباچہ دیوانِ گوہرانتخاب (قلمی)''، ''کتاب معائنۂ کتب خانۂ رام پور (قلمی)'' اور ''رسالہ بحثِ اعدادِ حروفِ تہجّی'' قابلِ ذکر ہیں

امیر بلاشبہ نہ صرف ایک بہترین شاعر تھے بلکہ ایک بہت ہی عمدہ نثّار بھی تھے۔ امیر کو اردو زبان پر غیر معمولی عبور حاصل تھا، ہندی اور سنسکرت بھی جانتے تھے۔ روزمرّہ، محاورے اور زبان کے رموز ونکات کے ماہر تھے۔ ان کی نثر بہت خوبصورت اور دل نواز انداز کی حامل ہے۔ گو کہ امیر کی ابتدائی نثر لکھنو کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے جس میں جا بجا الفاظ و تراکیب کا خوبصورت استعمال، مقفّیٰ و مسجّع عبارتیں تحریر کو فہم عام سے بلند کر رہی ہیں۔ مثلاً

''خداوندا اعمالِ بد پر سزا عین انصاف ہے مگر امیدوارانِ رحمت پر نظرِ عدالت اُن کی امید کے خلاف ہے۔ خاوندا جو تیری رحمت کی آس لگائے ہے اُس کا آسرا نہ توڑ۔ خداوندا کنجشکِ ضعیف کو شہبازِ عدالت کے مُنھ پر نہ چھوڑ۔ اے دادرس! خطراتِ نفسانی کے ہاتھ سے دادخواہ ہوں میری داد کو پہنچ۔ اے فریادرس وساوسِ شیطانی کے

مظالم کا فریادی ہوں میری فریاد کو پہنچ۔ دردمند ہوں دوا بھیج۔ مریض ہوں شفا بھیج۔ خسِ طوفانی ہوں گردابِ بلا سے نجات دے۔۔'' ۷۴ (ص۔۸۴) خیابانِ آفرینش

لیکن وقت کے ساتھ ساتھ امیر کے نظریات اور زبان میں واضح فرق بھی نظر آتا ہے۔ اگر اُس وقت کے معاشی و معاشرتی حالات پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ وہ زمانہ ہے جس میں ہندوستان کا مغلیہ نظام سیاسی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتے ہوئے نتیجۃً انگریزوں کی حکومت پر ختم ہوتا ہے۔ اور مسلمان ایک طرف تو پست سے پست ہوتے جا رہے ہیں اور دوسری طرف انگریزوں کے سائے میں پناہ تلاش کر رہے ہیں۔ انگریزوں نے صرف لال قلعہ پر انگریزی پرچم ہی نہیں لہرایا بلکہ خاندانِ مغلیہ اور مسلمانوں پر ظلم وستم کی ایک داستان رقم کر دی۔ انگریز تو انگریز ہندوؤں کو بھی اپنی کئی سو سالہ غلامی سے سر اُٹھانے کا موقع مل گیا۔ دہلی کے امرا، رؤسا اور اربابِ فن خستہ حالی اور فاقہ زدگی کے دن گذارنے لگے، شعرا اور ادبا ان حالات میں زمانے کی ناقدری اور جور وستم سے اس قدر بیزار ہو گئے کہ ان کا ذہنی کرب اشعار کی صورت میں ڈھلنے لگا، دہلی میں شعرا کی جو محفلیں آباد تھیں، برباد ہو گئیں۔ جو ادبی گہوارے تھے، اُجڑ گئے۔ اور لوگ ادھر سے اُدھر جائے پناہ تلاش کرنے لگے، ایسے میں رام پور اور لکھنؤ پہلی ترجیح نظر آئی، جہاں مسلم حکومت دراصل انگریزوں کی مرہونِ منت رہی اور دہلی میں حکومت ختم ہو جانے کے باوجود لکھنؤ اور رام پور میں مسلمانوں کا دورِ عشرت چلتا رہا۔۔۔ اور امیر اور ان کے معاصرین اس ماحول کے پروردہ تھے اس لیے اس سے باہر نہ نکل سکے۔ یا یوں کہیے کہ نکلنا ہی نہیں چاہا۔ اس کے باوجود زبان اور خیالات میں ایک واضح تبدیلی نظر آتی ہے۔ سرسیّد اور ان کے معاصرین کی بڑھتی ہوئی کوششیں ہر کسی کو متاثر کر رہی تھیں۔ دہلی کی شاعری میں خیال، مضمون اور پھر واردات مثلاً تشبیہات واستعارات، معاملہ بندی ومحاورہ بندی جیسے موضوعات کی کثرت رہی ہے لیکن اب ضرورت اس امر کی تھی کہ نئے طرز پر شاعری کو استوار کیا جائے، مغربی اثرات بھی اردو شاعری پر پڑنا شروع ہو چکے تھے یہی وجہ ہوئی کہ امیر کے خطوط کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ لیکن اس میں بھی لکھنوی زبان کی جھلک کہیں کہیں نظر آتی ہے۔

''میرے دل نواز، میرے قدر شناس، سید صاحب جسمی وروحی فداک آپ کا محبت نامہ مشعر مژدۂ صحت پہنچ کر سرمہ کش دیدۂ انتظار اور تسلّی بخش دلِ بے قرار ہوا۔ میں اب تک آپ کو خوش بیان وخوش تحریر جانتا تھا لیکن ماشاءاللہ خوش قلم اور پاکیزہ رقم بھی ہو۔'' ۷۵ (ص۔۲۳۰) مکاتیبِ امیر

امیر کے یہ سب خطوط جو شائع ہوئے وہ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۰۰ء تک کے ہیں۔ اور اس میں امیر کی زبان کا وہ رنگ واضح نظر آ رہا ہے جس پر امتدادِ زمانہ نے اپنا رنگ ڈالا ہے۔ وہ سلاست اور روانی جو اس وقت کا شعار تھیں غیر ارادی طور پر امیر کی تحریروں میں در آئی تھیں۔ اور ان خطوط کی روشنی میں یہ بات سب پر عیاں ہے کہ امیر نہ صرف ایک بہترین شاعر بلکہ بے حد عمدہ نثر نگار بھی ہیں۔ امیر کی دیگر تصانیف کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ امیر اپنی بات کو پُر اثر بنانے کے لیے کس احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ اور موضوع کی مناسبت کا خیال رکھتے ہیں۔ اگر انھیں بادشاہِ وقت کے سامنے کوئی تحریر پیش کرنی ہے تو عبارت کو دلہن کی طرح سجا کر مقفّٰی مسجع پیش کریں گے اور ایسی نادر تراکیب کا استعمال کریں گے کے سننے پڑھنے والا قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اگر مذہبی موضوع اختیار کریں گے تو ایسے پیرائے

میں لکھیں گے کہ مرد، عورت یہاں تک کہ بچے بچے کو بات آسانی سے سمجھ آ سکے، شاعروں کا تذکرہ لکھا تو اوّل اوّل زبان ہم قافیہ اور گنجلک نظر آئی لیکن آہستہ آہستہ طبیعت کی روانی نے زبان کو شستہ اور صاف کر دیا اور مکاتیب لکھنے کی طرف دھیان دیا تو ایسی بے تکلف زبان اختیار کی دلی محبت لفظوں میں آ کھڑی ہوئی۔ زمانے نے تیزی سے کروٹ بدلی تو شعراء کے مزاج میں بھی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں شاعری میں غزل سے نظم تک کا سفر طے کیا، پر یہ نئے امکانات کی روشن دلیل ہے کہ شعرا نے وقت کے مزاج کو سمجھتے ہوئے، برّصغیر کی حالت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے شاعری کو زبان کو اور خاص طور پر نثری تحریر کو نئے سانچے میں ڈھال دیا۔

انھیں ہر صنفِ سخن پر کامل دسترس حاصل تھی، انھوں نے وقت کی رفتار کو حال کے آئینے میں دیکھا اور وقت کا ساتھ دیتے ہوئے اپنے آہنگ کو بدل ڈالا امیر کی نثری تصانیف منظرِ عام پر نہ آنے کی وجہ سے لوگ ان کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں سے نا آشنا ہیں۔ اور امیر جیسے کامل استاد کی قدر و منزلت کو یہ کہہ کر گھٹا دیتے ہیں کہ امیر بہت اچھی نعت لکھتے ہیں۔ یا امیر بہت اچھے شاعر ہیں۔۔ لیکن یہ صدی امیر کی جہات کو تسخیر کرنے کی صدی معلوم ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ کیوں کہ امیر مینائی کی شخصیت و فن پر مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے کام کرنے والے محققین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

حواشی:

۱ ماہر القادری، ''نوادرِ امیر مینائی''، مشمولہ ''فاران''، مارچ ۱۹۵۱ء۔

۲ ممتاز علی آہ، ''سیرتِ امیر مینائی''، ص ۱۔

۳ جب کہ ممتاز علی آہ اور کریم الدین احمد کے مطابق آپ کا سلسلہ نسب حضرت عباس بن عبدالمطلب، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچتا ہے۔

۴ ابو محمد سحر، ''مطالعۂ امیر''، ص ۱۰۸۔

۵ ممتاز علی آہ، ''سیرتِ امیر مینائی''، ص ۱۴۰۔

۶ ایضاً، ص ۱۴۱۔

۷ خالد مینائی (مرتبہ)، غیرتِ بہارستان، ص ۱۰۔

۸ ماہر القادری، نوادرِ امیر مینائی، مشمولہ ''فاران''، مارچ ۱۹۵۱ء۔

۹ کریم الدّین احمد، ''امیر مینائی اور ان کے تلامذہ''، ص ۴۰۵۔

۱۰ ابو محمد سحر، ''مطالعۂ امیر''، ص ۳۵۹۔

۱۱ کریم الدّین احمد، ''امیر اور ان کے تلامذہ''، ص ۴۰۶۔

۱۲ ایضاً، ص ۴۰۸۔

۱۳ ایضاً، ص ۴۰۹۔

۱۴ ایضاً، ص ۴۰۵۔

۱۵ ایضاً،ص ۴۰۵۔

۱۶ ایضاً،ص ۴۱۶۔

۱۷ ارمغانِ امیر،ص ۵۳۔

۱۸ احسن اللہ ثاقب،''مکاتیبِ امیر مینائی''،ص ۲۸۔

۱۹ ابومحمد سحر،''مطالعۂ امیر''،ص ۶۷۔

۲۰ ممتاز علی آہ،''سیرتِ امیر مینائی''،ص ۶۷۔

۲۱ ارمغانِ امیر،ص ۵۳۔

۲۲ امیر مینائی،خیابانِ آفرینش،(مرتبہ،اسرائیل احمد مینائی)،ص ۱۰۔

۲۳ ابومحمد سحر،''مطالعۂ امیر''،ص ۳۶۳۔

۲۴ عبدالحکیم حکمت،''دبدبۂ امیری''،ص ۱۶۷۔

۲۵ یہ فہرستِ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ میں شامل ہے۔جو خیابانِ آفرینش (مرتبہ اسرائیل احمد مینائی) اور ڈاکٹر ظفر اقبال کے مقالے مشمولہ 'تحقیق' میں موجود ہے۔ص ۔۱۰/ص ۵۵۔

۲۶ ابومحمد سحر،''مطالعۂ امیر''،ص ۳۶۰۔

۲۷ ایضاً،ص ۔۳۶۰

۲۸ احسن اللہ ثاقب،''مکاتیبِ امیر مینائی''،(حضرت بشیر بلیخ آبادی کے نام)،ص ۳۴۵۔

۲۹ ایضاً،ص ۱۹۷۔

۳۰ عبدالحکیم حکمت،''دبدبۂ امیری''،ص ۱۷۰۔

۳۱ ابومحمد سحر،''مطالعۂ امیر''،ص ۳۶۴۔

۳۲ فہرست،مشمولہ 'خیابانِ آفرینش اور ڈاکٹر ظفر اقبال،ص ۱۰/ص ۵۵۔

۳۳ ابومحمد سحر،''مطالعۂ امیر''،ص ۳۶۴۔

۳۴ ایضاً،ص ۳۶۴۔

۳۵ امیر مینائی،انتخابِ یادگار،،ص ۷۔

۳۶ امیر مینائی،انتخابِ یادگار،ص ۴۰۶۔

۳۷ ایضاً،ص ۴۰۶۔

۳۸ ابومحمد سحر،''مطالعۂ امیر''،ص ۳۷۰۔

۳۹ امیر مینائی،انتخابِ یادگار،ص ۷۔

۴۰ ایضاً،ص ۷۔

۴۱ احسن اللہ ثاقب،''مکاتیبِ امیر''،ص ۲۴۵۔

۴۲ ایضاً،ص ۲۴۶۔

۴۳۔ امیر مینائی، انتخابِ یادگار، ص ۸۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۱۱۔

۴۵۔ ابو محمد سحر، ''مطالعۂ امیر''، ص ۳۷۲۔

۴۶۔ امیر مینائی، انتخابِ یادگار (طبقۂ دوم)، ص ۲۹۴۔

۴۷۔ ایضاً، ص ۱۳۷،

۴۸۔ ایضاً، ص ۲۴۱،

۴۹۔ امیر مینائی، خیابانِ آفرینش، ص ۹۔

۵۰۔ ایضاً، ص ۳۴۔

۵۱۔ ایضاً، ص ۳۷۔

۵۲۔ ایضاً، ص ۳۸۔

۵۳۔ ایضاً، ص ۳۸۔

۵۴۔ ایضاً، ص ۵۲۔

۵۵۔ ایضاً، ص ۸۴۔

۵۶۔ اسرائیل احمد مینائی (مرتبہ)، فہرستِ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلامِ امیر، مشمولہ: دیوانِ امیر (مراۃ الغیب)، مطبوعہ ۲۰۰۵، کراچی۔

۵۷۔ وجیہی، شعائر اللہ خان، ڈاکٹر، حیاتِ امیر مینائی: کچھ نئے ماخذ، مشمولہ، رضا لائبریری جنرل رام پور، شمارہ ۳، ص ۲۰۵۔

۵۸۔ احمد، کریم الدّین، امیر مینائی اور ان کے تلامذہ، ص۔ ۴۴۹، بحوالہ ڈاکٹر جاوید اقبال: ''مکتوباتِ امیر مینائی کا تحقیقی جائزہ''، ص ۱۶۵۔

۵۹۔ محولہ بالا، بحوالہ ڈاکٹر جاوید اقبال، ص ۱۶۵۔

۶۰۔ امیر مینائی، امیر اللغات (جلد سوم)، مرتبہ: ڈاکٹر رؤوف پاریکھ، ص ۱۲۔

۶۱۔ امیر مینائی، دیباچہ: امیر اللغات (جلد اوّل)، ص ۲۔

۶۲۔ ایضاً، ص ۳۔

۶۳۔ امیر مینائی، امیر اللغات (جلد دوم)، ص ۱۔

۶۴۔ ممتاز علی آہ، ''سیرتِ امیر مینائی''، ص ۳۳۔

۶۵۔ رؤف پاریکھ، ''امیر مینائی کی لغت نویسی اور اصولِ تحقیق''، مشمولہ ''تحقیق''، شمارہ ۱، جنوری تا جون ۲۰۱۰ء۔

۶۶۔ نسرین ممتاز، ''خط کا مفہوم، تعریف اور مکتوب نگاری کی روایت''، مشمولہ ''تحقیق''، شمارہ ۱، جنوری تا جون ۲۰۱۲ء۔

۶۷۔ احسن اللہ ثاقب، ''مکاتیبِ امیر مینائی''، ص ۱۰۔

۶۸۔ ابو محمد سحر، ''مطالعۂ امیر''، ص ۳۸۹۔

۶۹۔ احسن اللہ ثاقب، ''مکاتیبِ امیر مینائی''، ص ۱۰۔

۷۰۔ نسرین ممتاز، ''خط کا مفہوم، تعریف اور مکتوب نگاری کی روایت''، مشمولہ ''تحقیق''، شمارہ ۱، جنوری تا جون ۲۰۱۲ء۔

۷۱۔ ممتاز علی آہ، ''سیرتِ امیر مینائی''، ص ۱۵۰۔

۴۲؎ رؤف پاریکھ، ''امیر مینائی کی لغت نویسی اور اصولِ تحقیق''، مشمولہ ''تحقیق''، شمارہ ۱، جنوری تا جون ۲۰۱۰ء، ص ۸۱۔

۴۳؎ ممتاز علی آہ، ''سیرتِ امیر مینائی''، ص ۱۵۰۔

۴۴؎ امیر مینائی، ''خیابانِ آفرینش''، ص ۸۴۔

۴۵؎ احسن اللہ ثاقب، ''مکاتیبِ امیر''، ص ۲۳۰۔

فہرستِ اسنادِ محولہ:

۱۔ آہ، ممتاز علی: ۱۹۴۱ء، ''سیرتِ امیر مینائی''، ادبی پریس، لکھنؤ۔

۲۔ احمد، کریم الدین، ڈاکٹر: ۱۹۸۲ء، ''امیر مینائی اور ان کے تلامذہ''، آئینہ ادب، لاہور۔

۳۔ تھانوی، میکش: سنہ ندارد، ''یادگارِ امیر مینائی''، مطبع مفید، حیدر آباد دکن۔

۴۔ ثاقب، احسن اللہ: ۱۹۲۴ء، ''مکاتیبِ امیر مینائی''، (طبع دوم)، مطبعۂ ادبیہ لکھنؤ۔

۵۔ جاوید اقبال، سیّد، ڈاکٹر: ۲۰۰۲ء، ''مکتوباتِ امیر مینائی کا تحقیقی جائزہ''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی جام شورو۔

۶۔ حکمت، عبدالحکیم: ۱۹۳۷ء، ''دبدبۂ امیری''، برقی پریس، پٹنہ۔

۷۔ سحر، ابومحمد، ڈاکٹر: ۱۹۶۵ء، ''مطالعۂ امیر''، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ۔

۸۔ صدیقی، آفتاب احمد: سنہ ندارد، ''صہبائے امیر''، مکتبۂ عارفین، ڈھاکہ۔

۹۔ عباسی، عرفان: ۱۹۸۵ء، ''دبستانِ امیر مینائی''، شایع کردہ مصنف، لکھنؤ۔

۱۰۔ علوی، امیر احمد: ۱۹۲۸ء، ''طُرّۂ امیر''، انوار المطابع لکھنؤ۔

۱۱۔ مانک پوری، جلیل حسن: ۱۳۴۷ھ، ''سوانح امیر''، پبلشر ندارد۔

۱۲۔ مینائی، احمد، امیر: ۲۰۰۵ء، ''دیوانِ امیر'' معروف بہ اسم تاریخی ''مراۃ الغیب''، طبع دوم، کراچی۔

۱۳۔ _____: س ن، ''غیرتِ بہارستان''، مرتبہ خالد مینائی، ادارۂ فروغِ اردو، لاہور۔

۱۴۔ _____: ۲۰۱۰ء، ''خیابانِ آفرینش و محامدِ خاتم النبیین''، ایوانِ امیر مینائی، کراچی۔

۱۵۔ _____: ۲۰۰۵ء، ''دیوانِ امیر''، مرتبہ اسرائیل احمد مینائی، ایوانِ امیر مینائی، کراچی۔

۱۶۔ _____: ۱۹۸۹ء، ''دیباچہ امیر اللغات''، جلد اوّل و دوم (یک جا)، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور۔

۱۷۔ _____: ۲۰۱۰ء، ''امیر اللغات''، جلد سوم، مرتبہ ڈاکٹر رؤف پاریکھ، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور۔

۱۸۔ _____: ۱۲۹۰ھ، ''انتخابِ یادگار''، تاج المطابع لکھنؤ۔

رسائل:

۱۔ ''رضا لائبریری جنرل''، رام پور، شمارہ ۳۔

۲۔ ماہ نامہ ''فاران''، کراچی، ۱۹۵۱ء۔

۳۔ ''تحقیق''، شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی، جام شورو، شمارہ ۱، جلد ۱۸، جنوری تا جون ۲۰۱۰ء، شمارہ ۱، جلد ۲۰، جنوری تا جون ۲۰۱۲ء۔